ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.4.2025

ناول "گراں" پنجابی ثقافت کے تناظر میں ایک مطالعہ

محمد آصف ممتاز

پی ایچ ڈی اردو (اسکالر)، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر منزہ منور

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Tahira Iqbal is a prominent and respected name in Urdu fiction who in a short period of time has achieved a position through her stories that very few writers have access to. Today she is recognized as a knowledgeable, sensitive storyteller who is aware of the realities of her era. He has made the urban environment as well as the rural society the subject in his writings very carefully and has presented it in such a realistic manner that the atmosphere of the villages of Punjab is fully revealed to the reader. She is not only familiar with the rural society, the customs and psychological attitudes of the people there, but also creates an influential style by combining the rural dialect and accent with the elegance of Urdu. In his novels, he has eloquently described the culture of rural Punjab, its changing social and economic realities and the details of daily life there. This is the reason why his writings reflect the simplicity, traditions and changes of village life with great truth. "Garan" is his second novel published in 2019 by Jhelum Book Corner. The novel brings out the deep colors of Pothohari and Punjabi culture and also highlights the different roles and experiences of women. Tahira Iqbal's writings contain true, spontaneous and factual stories of rural society, and this truth is the real strength of her fiction.

Keywords: *Tahira Iabal, Urdu Novel, Punjabi Culture, Rural Life, Culture, Traditions, Society.*

ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں اجتماعی زندگی کے حقائق کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ یوں تو فنون لطیفہ کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جو اپنے ماحول اور سماجی عوامل سے بے نیاز ہو سکے۔ ناول حقائق کی جزئیات کا مشاہدہ پیش کرتا ہے۔ جس سے ہم ان اسباب و علل کا مکمل تجزیہ کر سکیں اور ان قدروں کے باہمی پیکار کو سمجھ سکیں جس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی متنوع انداز میں ہم پر منکشف ہوتی ہے۔ ناول خالصتاً اطالوی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی سے اردو میں آیا ہے۔ اس کے معنی "انوکھا، نرالا اور عجیب کے ہیں۔ اصطلاح میں ناول ایسے قصے یا کہانی کو کہا جاتا ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہوتا ہے۔ ناول کی ابتدا کے بارے میں احسان اکبر یوں رقم طراز ہیں:

> "ناول کا نام فرانسیسی زبان کے لفظ "نوویلا" سے مشتق ہے جس کے معنی کہانی کے ہیں۔ ناول نے بنیادی طور پر (Anti-Romance) کے طور پر جنم لیا (Anti-Romance) ہونے سے ہم کلاسیکی مزاج مراد نہیں لیں گے کہ یہاں اس سے وہ رویہ مراد ہے جو معیار پسندی۔ عظمت حسن، نفاست اور خصوصی اہمیت رکھنے والے کرداروں کی بجائے عام عومی اور معمولی کرداروں کی بھیڑ میں کسی کردار یا کرداروں کا سفر دکھا سکے۔ یوں ناول عمومیت پر اصرار کرتا ہے۔ یہی عمومیت اسے عام زندگی میں شامل ہو کر زیست کو عام و خاص سارے مظاہر سمیت دیکھنے کی توفیق بخشتا ہے۔ یوں اپنی صنفی ضرورت کے تحت ناول تخیل محض کی بجائے حقیقت پر اصرار کرتا ہے۔"(1)

ناول کی تعریف کرتے ہوئے آل احمد سرور "ناول کیا ہے" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> "ناول ہمارے ادب میں انگریزی کے اثر سے آیا۔ مغربی ادبیات میں چونکہ ہم عام طور پر انگریزی ادب سے ہی واقف ہیں اس لیے زیادہ تر ناول کی تاریخ اور تنقید میں انگریزی ادب کے شاہکاروں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ناول نے براعظم یورپ اور امریکہ میں ایک خاص اہمیت حاصل کی ہے اور فرانسیسی، روسی جرمن اور ناروے کے بعض مصنفین نے ناول کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔"(2)

ان تعریفات کی روشنی میں ناول کی تعریف کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے جس سے ایک مخصوص صنفِ افسانہ مراد ہوتی ہے اور جب یہ صنف انگریزی ادب کے زیر اثر ہماری زبان میں منتقل ہوئی تو اس کا نام "ناول" بھی اس کے ساتھ ہی چلا آیا۔ فن کی رو سے ناول اس نثری حصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی اور واقعی عکاسی کی گئی ہو۔ ناول کا مرکزی کردار انسانیت ہے اگر ہم ناول کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ اس مرکزی کردار پر صرف کرنا ہوگی۔ اگر ہم بنی نوع انسان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کوئی بھی شخص اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا۔ خود کو محفوظ رکھنے اور زندگی کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت پڑتی ہے۔ وحشی سے وحشی انسانوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا اور ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کی ضرورتوں نے انسان کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، ایک دوسرے کی مدد کرنے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے طرزِ عمل کو دوسروں کے قریب تر لانے کی خواہش کو جنم دیا انسانی فکر کا بنیادی عمل اتحاد کی خواہش سے انسانی زندگی میں سرگرمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ساتھ رہنے کی خواہش اور ایک دوسرے کی محتاجی کے بغیر کوئی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ معاشرتی زندگی کا یہ بنیادی عمل ہے۔ سیاسی و معاشرتی اتحاد بھی اس عمل سے جنم لیتا ہے اور ان سب کے امتزاج سے تہذیبی عمل اپنے نقوش ابھارتا ہے۔ اس خواہش کے زیرِ اثر طرز فکر و عمل کا اشتراک پیدا ہوتا ہے اور اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے افراد اپنے طرزِ عمل میں مشترک ہو جاتے ہیں۔ ان کے رسوم و رواج، خوشی و غم کے طریقے، لباس کھانے پینے، نشست و برخاست وغیرہ سب میں اشتراک پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک مکمل معاشرے کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ "فکر و عمل کا یہی روحانی رشتہ جو مشترک سے روایات کی بنیادوں پر مشترک طرزِ زندگی کا موجب بنتا ہے۔ اس معاشرے کا کلچر کہلاتا ہے۔" (3)

انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے "کلچر' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جبکہ اردو، فارسی اور عربی زبان میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب میں کسی علاقے کے باشندوں کی عادات و اطوار، رہن سہن، طرزِ زیست، فنونِ لطیفہ زبان پیداوار کے ذرائع، فلسفہ و حکمت یعنی اس علاقے کی تمام سماجی اقدار شامل ہوتی ہیں۔ گویا تہذیبِ انسانی سماج میں روابط کا مجموعہ ہوتی ہے۔ تہذیب و ثقافت کے درج بالا مفاہیم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لفظ تہذیب کا زور خارجی چیزوں اور طرزِ عمل کے اس اظہار پر ہے جس میں خوش اخلاقی، اطوار، گفتار و کردار شامل ہیں اور لفظ ثقافت کا زور ذہنی صفات پر ہے جن میں علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنا اور ترقی دینے کی صفات شامل ہیں۔ تہذیب و ثقافت کو اکٹھا کر کے انگریزی کا لفظ کلچر استعمال کیا جاتا ہے کلچر لفظ زندگی کی ساری سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے خواہ وہ سرگرمیاں ذہنی ہوں یا مادی خارجی ہوں یا داخلی۔ لفظ کلچر کی وضاحت مختلف محققین نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے کی ہے کچھ لوگ کلچر سے مراد کھیتی باڑی، زراعت، مویشیوں کو استعمال میں لانے کے طریقے اور دیہاتی امور میں مویشیوں اور اجناس کی اہمیت لیتے ہیں۔ بعض محققین کلچر کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ انسانوں کے مل جل کر رہنے سے جو معاشرہ پروان چڑھتا ہے اسے کلچر کہتے ہیں کیونکہ ہر علاقے کے لوگوں کا کلچر دوسرے علاقوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ کسی بھی خطے کی تہذیب و معاشرت کی حقیقی بنیادوں کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں شہر کو چھوڑ کر دیہات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے کیونکہ کسی بھی تہذیب کے ابتدائی نقوش انہی علاقوں سے حاصل ہوتے ہیں ڈی ڈی کوسمبی جب ہندوستان کی تہذیب کا تاریخی نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو وہ ہندوستان کی دیہی معاشرت کو شہری معاشرت پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانی تہذیب کا قوام دیہاتی معاشرے سے وجود میں آیا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

" معاشرت کی مختلف تہوں میں قدیم اوزع و اطوار کے ایسے باقیات موجود ہیں جن کی مدد سے قبل کے کلیتاً متنوع معاشرتی مدارج کا خاکہ از سر نو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے کے ان قدیم و جدید مدارج طبقات کو پانے کے لیے شہروں کو چھوڑ کر دیہی علاقوں میں جانا ضروری ہے۔"(4)

دیہی تہذیب طبعی حالات اور مٹی سے جنم لیتی ہے۔ یہ تہذیب شہروں کی نسبت بیرونی حملہ آوروں سے زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ اس لیے اس تہذیب میں دھرتی سے سچے جذبات کی بُو رچی بسی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شہروں کی طرزِ زندگی پر صنعت و حرف اور تجارتی مراکز ہونے کی وجہ سے بیرونی تہذیبوں کے اثرات زیادہ ہوتے ہیں

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL

Vol.8. No.4.2025

جس کی وجہ سے شہروں کی معاشرت میں مقامی تہذیب کے علاوہ بہت سی دوسری تہذیبوں کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں اور ایک مخلوط معاشرت وجود میں آجاتی ہے۔ شہروں کی تہذیبوں کا اثر دیہاتوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے دیہی اور قصباتی علاقوں کی سماجی اقدار اور طرزِ زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ سائنسی ترقی کی بدولت دنیا ایک گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اس سے تیز رفتار سائنسی ترقی کے باوجود پھر بھی دیہات میں روایتی سماجی اقدار اور رسوم و روایات کی پیروی کو لازمی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اہل دیہات اپنے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی رسوم قیود سے باہر نکلنا اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں اور رسوم سے گستاخی سمجھتے ہیں۔ اس لیے آج اگرچہ دیہات کے اکثر گھروں میں ریڈیو، ٹی وی اور دیگر سہولتیں میسر ہیں لیکن پھر بھی سرگشتہ رسوم و قیود کے بڑی حد تک قائل اور ان پر عمل کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس فرق کو واضح کرتے ہوئے اپنی کتاب دائرہ اور لکیریں میں لکھتے ہیں کہ:

> "وقت کی مسلسل یلغار کے آگے مشکل ہی سے کوئی دیوار ٹھہر سکتی ہے۔ لہٰذا ہر گاؤں داخلی و خارجی دونوں اعتبار سے ایک مسلسل متغیر کی زد میں آکر تبدیل ہوتا رہتا ہے مگر تمام تبدیلیوں کے باوجود ہر گاؤں کے عقب میں ایک گاؤں بغیر کسی تبدیلی کے سدا موجود رہتا ہے۔"(5)

ادیب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور اس کی تحریر خواہ وہ کسی بھی صنفِ ادب سے تعلق رکھتی ہو، نثر ہو یا شاعری اپنے عہد کی آواز ہوتی ہے جو اپنے عہد کے لوگوں، رویوں، رجحانات، تہذیب و تمدن، ثقافت، سیاست، معاشرت، اخلاق و اطوار، عادات، تعلقات، باہمی روابط، انفرادی و اجتماعی زندگیوں سے آنے والی نسلوں اور زمانوں کو روشناس کرتی ہے۔ طاہرہ اقبال اردو افسانوی نثر کی ایک معتبر اور نمایاں مصنفہ ہیں جنہوں نے مختصر عرصے میں اپنی کہانیوں کے ذریعے وہ مقام حاصل کیا جو بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آتا ہے۔ وہ عہدِ حاضر کی ایک باشعور اور حساس تخلیق کار ہیں جنہوں نے نہ صرف شہری زندگی بلکہ دیہی معاشرت کو بھی اپنی تخلیقات کا اہم موضوع بنایا۔ ان کی کہانیوں میں پنجاب کے دیہاتی کلچر کی ایسی حقیقی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ قاری اس ماحول کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال دیہاتی زندگی کے مسائل، وہاں کے لوگوں کے جذبات و نفسیات اور ان کی روزمرہ بول چال سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ مقامی لہجے اور زبان کو اردو کے فنی سانچے میں اس خوبصورتی سے ڈھالتی ہیں کہ ایک دلکش بیانیہ وجود میں آتا ہے۔ اپنی تخلیقات میں وہ پنجاب کے دیہات کے مخصوص ثقافتی رنگ، فطری مناظر، ہوا میں بسی مٹی کی خوشبو اور سماجی و معاشی تبدیلیوں کو نہایت باریک بینی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ طاہرہ اقبال کے افسانوی ادب میں ایک خاص تہذیبی و ثقافتی رنگ جھلکتا ہے، جو ان کے تخلیقی انداز کو منفرد بناتا ہے۔ ان کی تحریروں میں مقامی روایت، سچائی، لوک داستانوں کی جھلک، اور امید کی روشنی اس انداز سے یکجا ہوتی ہے کہ قاری کو ایک گہرے تخلیقی تجربے سے گزارتی ہے۔ ان کے کردار، جو وسطی پنجاب کے دیہی ماحول سے جڑے ہوتے ہیں، صرف رومانوی تصورات تک محدود نہیں بلکہ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہ وہ محنت کش لوگ ہیں جو معاشرے میں حاشیے پر دھکیلے گئے اور جن کی آواز اکثر دب جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال کے ہاں پنجابیت اپنے پورے جوبن کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

ان کے ناولوں میں پنجابی الفاظ کی کثرت اور کرداروں میں پنجابی لب و لہجہ بہت نمایاں ہے۔ طاہرہ اقبال کا فن صرف عورت کے دکھ بیان کرنے تک محدود نہیں بلکہ وہ ان دکھوں سے نکلتی ایک ایسی سوچ اور عزم کو پیش کرتی ہیں جو ظلم کے اندھیروں میں امید کا چراغ بن کر جلتی ہے۔ انہوں نے معاشرے میں رائج ان فرسودہ روایات کو چیلنج کیا ہے جو عورت کو پست رکھنے کا باعث بنتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں عورت کا کردار ہمیشہ ایک جیتی جاگتی، متحرک اور باوقار شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لمحات جب عورت شدید نفسیاتی یا معاشرتی دباؤ کا شکار ہوتی ہے، تب بھی وہ اپنی انفرادیت اور فطری عظمت کو قائم رکھتی ہے۔ طاہرہ اقبال کے نسوانی کردار مختلف روپ اختیار کرتے ہیں — کبھی ماں، کبھی بیٹی، کبھی محبوبہ، تو کبھی ایک مظلوم یا بااختیار عورت۔ ان کی تحریر میں عورت کا ہر کردار داخلی اور خارجی کشمکش سے دوچار نظر آتا ہے، اور یہی کشمکش اس کے وجود کو مزید معنویت عطا کرتی ہے۔

گراں" طاہرہ اقبال کا دوسرا ناول ہے، جو 2019 میں اسلام آباد سے دوست پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس سے قبل وہ اپنا پہلا ناول "نیلی بار" شائع کر چکی ہیں، جو ایک وسیع موضوعاتی دائرہ رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، "گراں" ایک نسبتاً مختصر پلاٹ پر مبنی ہے، مگر اس کا مرکزی موضوع نہایت اہم اور منفرد ہے۔ اس ناول میں طاہرہ اقبال نے پوٹھواری ثقافت کی جھلک دکھانے کے ساتھ ساتھ خواتین کے کردار کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مزید برآں، انہوں نے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

مختلف معاشرتی اور تہذیبی پس منظر بھی قاری کے سامنے پیش کیے ہیں۔ناول بنیادی طور پر چار حصوں پر مشتمل ہے۔ناول کے پہلے حصے کا عنوان "چوا پاک" ہے، جو تقسیمِ ہند کے فوراً بعد کے پوٹھوہاری معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔اس زمانے میں پرانی روایات دم توڑ رہی تھیں، جبکہ نئی ثقافتی اقدار ابھی مکمل طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئیں۔کردار ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور تقسیم سے پہلے کے ماحول سے جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔ان کے اذہان میں اب بھی وہی مناظر تازہ ہیں جو بٹوارے سے قبل کے زمانے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ناول کا دوسرا حصہ "تاج محل" کے عنوان سے ہے، جس میں پوٹھوہار کی تہذیبی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک، خاص طور پر انگلینڈ میں آباد ہندوستانیوں کی زندگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ستر کی دہائی میں یہاں کے مرد بڑی تعداد میں روزگار کے لیے بیرونِ ملک چلے گئے، جس سے دیہات سنسان ہو گئے۔خواتین، بزرگ اور بچے پیچھے رہ گئے۔خواتین جدائی کے دکھ میں گیت گاتیں، بچے جدید اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے، اور گھروں میں شہری سہولیات متعارف ہو گئیں۔گاؤں کی وہ جگہیں جو کبھی میل جول کا مرکز تھیں، ویرانی کا شکار ہو گئیں۔اب روایتی انداز کی جگہ جدید سہولیات، جیسے کہ گیزر، کولر اور واشنگ مشینیں لے چکی تھیں۔مقامی کھیت کھلیان اجڑنے لگے، اور ثقافتی میلے یادِ ماضی بن گئے۔راستے پختہ ہو گئے اور دیہاتی علاقوں میں بیرونِ ملک کی کمائی سے درآمد شدہ گاڑیاں دوڑنے لگیں۔اسلام آباد میں شاندار کوٹھیاں بننے لگیں جو سفارت کاروں اور افسران کے زیرِ استعمال آئیں، اور ان کے کرایے سے نئی نسل خوشحال ہونے لگی۔وقت نے خواتین کی تعلیم پر سے قدغن ہٹا دی، اور اب وہ لڑکیاں جو پہلے تعلیم سے محروم تھیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں تک پہنچ چکی تھیں۔

تیسرا حصہ "چودھری محمد اکرم NZD Vs" کے عنوان سے ہے۔اس حصے میں دیہی اور جدید تہذیبوں کا تقابلی جائزہ دو کرداروں—چودھری محمد اکرم اور نذیر احمد—کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔چودھری اکرم دیہی ثقافت کی نمائندگی کرتا ہے، جب کہ نذیر جدید مغربی اقدار کا علم بردار ہے۔اس تقابل سے مصنفہ یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ دیہی معاشرت کے تضادات سماج کو، جب کہ مغربی معاشرتی پیچیدگیاں فرد کو نقصان پہنچاتی ہیں۔نذیر احمد کی کہانی کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ مشرقی باشندے مغرب میں دہائیوں سے رہنے کے باوجود وہاں کی ثقافت کا حصہ نہیں بن سکے۔مقامی لوگ انھیں کمتر، غیر اہم اور اجنبی تصور کرتے ہیں۔ان کے رسم و رواج، زبان اور جسمانی وضع قطع کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔حتیٰ کہ اگر وہ اپنی شناخت، زبان اور مذہب چھوڑ بھی دیں تو بھی انھیں مرکزی مقام حاصل نہیں ہو پاتا۔

ناول کا چوتھا اور آخری حصہ "میری کالی مرغی کھو گئی" کے عنوان سے ہے، جو مشرقِ وسطیٰ خصوصاً سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔کئی پاکستانی یہاں عمرہ یا حج کے ویزوں پر آ کر غیر قانونی طور پر قیام پذیر ہو جاتے ہیں اور کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔پولیس کے چھاپوں کے دوران وہ گرفتار ہو کر جیل بھیج دیے جاتے ہیں یا وطن واپس بھیج دیے جاتے ہیں۔طاہرہ اقبال نے اپنے کرداروں کے ذریعے پنجابی تہذیب اور ثقافت کے زوال کا منظر نہایت دردمندی سے پیش کیا ہے۔ان کرداروں کے تجربات اور دکھوں کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ قاری کے دل میں نفرت کے بجائے ہمدردی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ناول "گراں" میں مردوں کی نسبت عورتوں کے کردار زیادہ نمایاں اور مؤثر ہیں، جن کی تشکیل میں مصنفہ نے خاص توجہ اور محنت سے کام لیا ہے۔بعض مقامات پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ کہانی عورتوں کے مختلف پہلوؤں کی ایک تصویری نمائش ہے۔شکیلہ جان، صنوبر جان، محمد جان، میرن، فاطمہ، تائی بختو، رحمت جان، غزل جان، ساریہ جان اور جسبیر کور جیسے نسائی کردار اصغر خان، اکبر خان، عثمان خان، حکم داد، اظہار الحق، مختار، چودھری نذیر، چودھری محمد اکرم اور تاج جیسے مرد کرداروں کے مقابلے میں زیادہ متحرک اور مؤثر دکھائی دیتے ہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ پوٹھوہار کی وہ ثقافتی ساخت ہے جہاں عورتیں گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ زراعت میں بھی سرگرم کردار ادا کرتی ہیں، جبکہ مرد عموماً روزگار کی تلاش میں فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں یا بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں۔

گاؤں کی صبح کا منظر ہمیشہ سے مسحور کن رہا ہے۔صبح کے تارے کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی گاؤں میں روزمرہ زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے، لوگ بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔مرد حضرات مسجد کا رخ کرتے ہیں اور عورتیں گھر میں ہی نماز کی تیاری شروع کر دیتی ہیں۔نماز سے فراغت کے بعد کسان کھیتوں کا رخ کرتے ہیں، عورتیں گھر میں چکی چلانے کے ساتھ ساتھ دودھ میں مدھانی ڈال دیتی ہیں۔اس ناول کے آغاز میں بھی گاؤں کی ایک خوبصورت سرد صبح کے منظر کی عکاسی کی گئی ہے۔:

"میلوں گہرے کسوں، نشیبوں، اترائیوں اور کوسوں بلند نکھی دندیوں اور چوٹیوں پر چڑھ بیٹھی آسیب زدہ تاریکی کو چیرتی
تیز گام، کوکتی چنگھاڑتی ہوئی کسوں پہاڑوں میں رات بھر بجنے والے جنات کے ڈھول باجوں کے ردھم کو لپیٹ لے گئی۔

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

سوئے ہوئے جاگے۔ چولھوں پر دھرے گرم پانی کے تسلوں سے لوٹے بھر عورتیں لڑی (نشیب) میں اتر گئیں اور مرد مسجد کو چلے۔

تنوروں سے تازہ تازہ اترتی مکئی جوار کی موٹی موٹی روٹیوں کی مہک پوہ ماگھ کی ٹھٹھرتی صبح میں جیسے گرم گرم سانسوں کی ٹکور کرتی ہو۔

خانماں جان نے چاٹی کی کمر میں پیر کا وزن ڈال کر مدھانی کی رسیاں زور سے کھینچیں۔ مکھن کی موٹی تہہ میں مدھانی بھاری ہو کر ٹھہر گئی۔ باجرے مکئی کی بھاپ چھوڑتی روٹیوں پر مکھن کی سفید جاگ سی پگھلنے لگی۔"(6)

ناول میں جابجا دیہاتی مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ گاؤں کی ایک اور بڑی خوبصورت روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہاں لوگوں کی کوئی الگ تھلگ پہچان نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے خاندان کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہاں یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ میرے بیوی بچے ہیں بلکہ نئی نسل کی پہچان ان کے پرکھوں کے خاندان سے ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

"یہ کہنے کا وہاں دستور ہی نہ تھا کہ یہ میری بیوی ہے میرے بچے ہیں ۔۔۔۔۔۔ بہو پوتے بیٹی نواسے کے حوالے سے شناخت ہوتے ہیں۔ پچھلی نسل اس سے پچھلی نسل سے ۔۔۔۔۔۔ بعض خاندان پرکھوں سے چلتے ہیں۔ ہر نئی نسل کی شناخت پچھلی نسل، پوتا، پڑپوتا۔۔۔۔۔۔۔ بیٹا کہنے کی نوبت جب آتی تو خود بیٹا پوتوں والا ہونے کو ہوتا۔"(7)

دیہی تمدنی صورتِ حال کے حوالے سے دیکھا جائے تو گاؤں میں محدود گھر ہوتے ہیں جو شروع سے ہی ایک جگہ رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہوتا ہے اس طرح یہ کھیتوں میں گندم، جوار، مکئی اور مونگ پھلی اگاتے ہیں، وہ بھی اتنی مقدار میں کہ پیٹ بھوکے نہ رہیں۔ گاؤں والوں کا رہن سہن انتہائی سادہ ہوتا ہے جس میں نمود و نمائش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ کے حوالے سے عموماً عورتوں کا جوڑ پھپھیرے، مسیرے، ممیرے بھائیوں سے بنتا ہے، انہی کے نام کی چھاپ عمر بھر کے لیے ان کے ساتھ لگ جاتی ہے۔ عورتیں سردیوں میں سویٹر بنتی رہتی ہیں، مرد موٹے کپڑے کی قمیض اور اونی سویٹر پہنے دور دراز کے بازاروں میں جانور بیچنے نکل جاتے اور واپسی پر گندم اور چینی کی بوریاں لاتے۔ ناول "گراں" میں تمدنی عکاسی یوں کی گئی ہے کہ:

پوری سردیاں لڑکیاں سویٹر بنتی رہتیں کہ ہر ہر اونی گھر میں دل جگر پروتی رہتیں۔ دس گھرانوں کے اس پہاڑی گاؤں کو چہار اطراف سے لپیٹے مٹیالے پتھریلے پہاڑی سلسلوں کی چوٹیوں پر پھوپڑتی رہی۔ یہاں برف تو نہ جمتی تھی لیکن صفر درجہ حرارت میں اوس کے قطرے یا بارش کی بوندیں، نیچے اترتیں تو ٹھٹھرا کر کہرا بن جاتیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بارش شروع ہوتی تو پانچ چھ روز چوٹیوں کو دھوتی۔ ڈھلانوں سے اترتے ریلے کسوں کھیتوں، ندی نالوں میں موجود نباتات کو ٹھٹھرا کر جھلسا کر مار ڈالتے۔

مرد روئی بھری صدیاں پہنتے جن پر موٹے کپڑے کی قمیصیں اور اونی سویٹر پھر کوٹ پہنتے اور اوپر اوور کوٹ جن پر دھسے لپٹے ہوتے۔ چھتریاں تانے کبھی پنڈی کبھی ساگری، سہالے، روات ادھر گوجر خان، چکوال اور اٹک تک جانوروں کی گاڑیاں بھر بھر لے جاتے اور واپسی پر گندم اور چینی کی بوریاں لاتے۔ کبھی جنگل سے لکڑیاں کٹوا کر چھکڑے لاد گوجر خان اور دینہ کی لکڑ منڈی میں لے جاتے اور گرم کپڑے اور اون کے گولے بدلے میں لاتے۔" (8)

رسم و رواج کسی بھی تہذیب و ثقافت کا لازمی عنصر ہوتے ہیں۔ شادی بیاہ کا موقع ہو یا اموات ہر معاشرے کی اپنی مخصوص روایات ہوتی ہیں جن کے مطابق وہ اپنی رسومات سرانجام دیتے ہیں۔ اس ناول میں بھی ان رسومات کو بھرپور طریقے سے بیان کیا گیا ہے جس میں شادی بیاہ کے سامان جس کو بری کہتے ہیں اس کی تفصیل کے ساتھ ساتھ بیاہ کے گیتوں کو بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ شادی کے دن نزدیک ہوں تو گاؤں میں عورتیں رات کو ڈھولک کی تھاپ پہ شادی کے گیت گاتی ہیں جس میں ہر گھر سے اور

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

عموماً قریب کے گاؤں سے بھی عورتیں اپنی حیثیت کے مطابق مٹھائیوں کی پراتیں بھر کر ساتھ لے جاتی ہیں اور یہ سلسلہ مہندی کی رات تک جاری رہتا ہے۔ اس کی ایک جھلک ہمیں اس ناول "گراں" میں بھی نظر آتی ہے:

"سارے گراؤں مین کی گیتوں کا سدا (بلاوا) دینے گیا۔ مغرب کی اذان کے بعد ہر گراں سے عورتیں پتاشوں، مونگ پھلیوں، اور گڑ شکر سے بھری پراتیں کمنیانیوں کے سروں پر رکھوا، ڈھولچی ساتھ لگا ادھر بنے گراں رتھ کنارے ڈھول کی تھاپ کے ساتھ پہنچتیں۔ ادھر ہم سب وڈھے مہرے والیاں ڈھولچی ساتھ لیے انہیں آگے لینے کو جاتیں۔ باریاں دیتیں ٹپے گاتیں، سٹھنیاں سناتیں۔ ابھی انہیں گھر لا کر بٹھاتیں تو خبر ملتی کسی اور گراں سے دوستالا آ پہنچا ہے۔ ادھر ساگری، روات ادھر سہوان سے گوجر خان تک سارا پوٹھوار آ پہنچا۔۔۔۔" (9)

گاؤں میں لڑکیوں کے بیاہ کے موقعوں پر ادا ہونے والی خوبصورت رسموں میں ایک رسم لڑکی کا مایوں بیٹھنا بھی ہوتا ہے۔ اس رسم کا رواج دیہاتوں کے ساتھ ساتھ شہروں میں بھی موجود ہے۔ مایوں کی رسم ادا ہو جانے کے بعد لڑکی کا گھر سے نکلنا بند ہوتا تھا۔:

"ہو کولوٹی! کڑی جے کر مایوں بیٹھتی تو مہینہ بھر کسی کی نظر نہ پڑتی۔ دن بھر پیشاب بھی روکے رکھتی۔ باہر نکلتی بھی تو جب سارا گراں سو جاتا تو سہیلیوں کے جھرمٹ میں یہ بڑی سی چادر میں منہ سر لپیٹے ہوئے نکلتی۔ گرمیوں میں بھی صحن میں نہ سوتی کہ کہیں تیل ہلدی کی خوشبو سے کوئی جن پریت مست نہ ہو جائے۔"(10)

فوت ہونے والے عزیز و اقارب کو یاد کرنا، ان کے لیے اظہارِ غم اور ان کی آخری رسومات کے حوالے سے ہر ثقافت اور مذہب میں الگ الگ طریقے اور رسومات رائج ہیں۔ یہ رسوم مذاہب کی تعلیمات، اس علاقے کی ثقافت، رسم اور خود فوت شدگان کے مالی حالات پر بھی منحصر ہو سکتی ہے۔ گاؤں میں عموماً موت کے بعد ہر طرف سے تعزیت کے لیے لوگ امڈ آتے ہیں اور عورتیں بڑے پر درد انداز میں بین کر کے سنگ دل لوگوں کو بھی رونے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اسی طرح کے ایک منظر کی عکاسی اس ناول میں بھی ہمیں ملتی ہے:

"پوٹھوار کی میت بھی پہاڑی علاقوں کے جفاکش افراد کی طرح ہی پر مشقت اور طویل ہوتے ہیں۔ پورے چالیس دیہاڑے پھوڑی پڑی رہی۔ ہر روز ادھر ساگری، روات، پنڈی، گوجر خان ادھر جہلم، چکوال، اٹک تک سے مقانیں (تعزیتیں) آتیں اور تین تین گھنٹے جم کر ماتم کیا جاتا۔ منہ سے چادریں ہٹا کر ابھی سوجی ہوئی آنکھیں پونچھتیں کہ پھر کوئی مقان آن پہنچتی۔ رانیں اور سینے پیٹ پیٹ چھد گئے۔ منہ سر کوٹتے ہوئے انگلیاں چھپ چھپ آنکھیں باہر ابل آئیں۔ آنسو بہا بہا پلکیں جھڑ گئیں۔ بین ڈال ڈال حلق بیٹھ گئے لیکن ماتم تھا کہ چالیس دیہاڑے یوں برپا رہا جیسے انور خان کی خون ابلتی لاش ابھی سامنے پڑی ہو۔۔۔۔ جمعراتیں ہوتیں چالیسویں پر بڑا کھانا ہوا اور پھوڑی اٹھا دی گئی لیکن مقانیں پھر بھی آتی رہیں پھر پھوڑی بچھتی عورتیں چار پانچ گھنٹے مل کر روز روتیں اور شب بھر ڈونگھے لڑکی جنیاں انہی بینوں کی بازگشت سے طویل و عریض نشیبوں کو سجائے رکھتیں۔ قریب کے گراؤں کی عورتیں دن میں دو بار ضرور پھوڑی پر آ کر گھنٹوں بیٹھتیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ حزنیہ شاعری جیسے بین ڈالتیں۔"(11)

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ماضی میں جب بھی کوئی وبا پھیلتی تھی تو سینکڑوں لوگ پل بھر میں لقمہ اجل بن جایا کرتے تھے۔ کیونکہ دیہات میں صفائی کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا اور لوگ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اس لیے وہاں اموات کی شرح کافی زیادہ ہوتی تھی۔ ہیضہ، طاعون، ٹی بی جیسی بیماریوں سے گھروں کے گھر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ طاعون ایک وبائی مرض جو کہ چوہوں سے پھیلتا ہے یہ ماضی میں لاعلاج بیماری تھی۔ یہ اتنی مہلک تھی کہ گاؤں کے گاؤں خالی ہو جایا کرتے تھے اور بعض اوقات علاج کے لیے بیرونی ممالک سے ڈاکٹر بلائے جاتے تھے مگر چند ایک لوگ ہی جانبر ہو سکتے تھے۔ ایسی صورتِ حال کی عکاسی ہمیں اس ناول میں بھی دکھائی دیتی ہے۔:

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ہائے گھروں کے گھر اٹھ گئے۔ گلٹی والی بیماری ایسی پھیلی قبروں کے لیے جگہ نہ رہی۔ جنازے پڑھنے کو انسان نہ بچے۔ سو، جی تھے اس گراں میں بس سترہ جنے اور تیرہ زنانیاں بچیں۔ ساگری ویہلا (خالی) ہو گیا۔ روات، کلعام ویران ہو گئے۔ ادھر لبانی بنگلے میں انگریز ڈاکٹر آ کر کئی کئی دن رہے پر موت کا علاج بندے کو تھوڑی دیا ہے اللہ جی نے۔ ہائے ہر پاسے موت کھلر گئی مانس گند چھوڑنے لگا۔ آسمان چیلوں کوؤں سے بھر گیا۔ بنا بتیسی کے جبڑوں سے پھونکنی کی طرح پھچ پھچ بین نکلے۔"(12)

وفاشعاری ایک ایسی صفت ہے جس پر کاربند رہتے ہوئے دیہاتی لوگ اپنی جانیں تو قربان کر سکتے ہیں مگر روایات سے بغاوت نہیں کرتے۔ دیہاتی عورت کی زندگی میں بھی یہ صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے وہ ایک دفعہ جس کے نام کے ساتھ جڑ جائیں پھر مرتے دم تک وفاداری نبھاتی ہیں۔ اس ناول میں زرینہ جان ایک ایسا کردار ہے جو فوجی کی منگ ہوتی ہے وہ محاذ پر جاتا ہے اور پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ مگر زرینہ جان اسی سے منسوب ہو کر رہ جاتی ہے اور زندگی بھر دوبارہ کبھی نکاح نہیں کرتی۔ ایسی صورتِ حال کی عکاسی اس ناول میں بھی دکھائی دیتی ہے:

زرینہ جان بھی فوجی کی منگ تھی نہ روئی نہ کرلائی مائیوں والے پیلے چیلے (دوپٹہ) میں لپٹی ساس کے گھر گئی اور بین کھینچا۔ دیکھ بے جی! تیری بہو اپ چل کے تیرے دیوارے آئی ہے۔ ساس بہو جو مل کر روئی ہیں تو پہاڑوں کے دل پھٹ گئے۔ ڈونگھے لڑ سے جنتیاں منہ سر پیٹتی ہوئی باہر چوٹیوں پر نکل آئیں۔ لے وہ دن اور آج کا دن اس در کو نہ چھوڑا۔ کیسے کیسے رشتے نہ آئے۔ ساس نے آپ منت کی تو کنج کنواری ہے۔ نکاح کے دو بول ہی تو پڑھے گئے تھے۔ پر ایک بار جو نام ساتھ جڑ گیا بس جڑ گیا۔ یہ تو پوٹھوار کی ریت ہی نہیں توبہ توبہ! اک واری جیہڑی منگی گئی مرد دیکھا کہ نہ دیکھا بس اسی نام کے لڑ لگ عمر گزار دی۔" (13)

مردوں کی دلیری اور جفاکشی ایسے اوصاف ہیں جن میں خوف کا مقابلہ کرنے، مشکلات کا سامنا کرنے اور حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت شامل ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو دیہاتی مردوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ دیہات میں رہنے والے مردوں کی بہادری کے قصے زبان زدِ عام ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی ایک فرد ہی تن تنہا پورے لشکر سے لڑ جاتا ہے اس طرح وہ گاؤں والوں کے ماتھے کا جھومر بن جاتا ہے۔ ہجرت کے وقت ہمیں بہت سے ایسے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ جو لوگ صدیوں سے ایک ساتھ رہتے چلے آ رہے ہیں بٹوارے کے وقت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ایک نوجوان تن تنہا سکھوں کو بحفاظت اپنے گاؤں سے کس طرح نکال کر حفاظتی کیمپ میں چھوڑ آتا ہے۔ اس ناول میں طاہرہ اقبال بہت عمدہ طریقے سے اس کی عکاسی کرتی ہیں۔:

"بڑے باواجی بہشتی چھت پر کھڑے لٹیروں، قزاقوں کو "توہ توہ" کرتے، ہائے آنکھوں پہ چربی چڑھی تھی وہی خونی بن گئے جن کے ساتھ برسوں نسلوں سے ہنستے بستے عمریں گزری تھیں۔ باوا خزان سنگھ ادھر چوبارے پر دس دن مہمان رہا۔ آپ بندوق ساتھ لے کر سارے پوٹھوار سے اگراہی کروائی۔ پیسہ پیسہ وصول کر کے دیا پھر اپنی حفاظت میں پنڈی کیمپ چھوڑ کر آئے۔ کسی مائی کے لال کو جرأت نہ ہوئی کہ سکھوں کے گھرانے پر میلی نظر ڈالے۔ باواجی بہشتی کندھے پر کارتوسوں والی پیٹی، دوسرے پر پستول چڑھائے ہاتھ میں بندوق پکڑے شملے پر مشہدی لونگی باندھ کر باہر نکلتے، کڑکڑ مائع والا سوٹ، اوپر کالی اچکن، راہوں کے کُکھ بھی اٹھ اٹھ دیکھتے۔ عورتیں گلیوں میں نکل آتیں، نظریں اتارتیں، کہتیں کس ماں نے لال جنا، ساڑھے چھ فٹ کا شیہ جوان۔ پورے پوٹھوار کے مرد سلام کرنے آتے۔ انگریز کچہری میں کرسی دیتے افسر اٹھ کر ہاتھ ملاتے۔"(14)

جب رویوں میں تبدیلی آنے کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگ بھی بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پیسہ انسان کی عادتوں اور مزاج کو بدل کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ گراں جہاں بیٹھکیں، بچے، اسلحہ، بستر سب سانجھا تھا اب شناخت چاہنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے نوجوان یورپی ممالک میں جانے کی حسرت دل میں لے کے بیٹھ جاتے ہیں۔ مکانات گاؤں کی

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

چیزوں کے بجائے ٹیلی ویژن، فریج، واشنگ مشین اور مختلف یورپی اشیاء ونوادرات سے بھر جاتے ہیں۔ بدلتے ہوئے پنجابی کلچر کی عکاسی ہمیں اس ناول میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے۔:

"پتھروں سے اسارے ہوئے مکانات شاندار کوٹھیوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ جن کی چھتوں پر پانی کے ٹینک رکھے تھے۔ ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی تھیں۔ گیزر اور ہیٹر چلتے تھے۔ اب چوے کا پانی کناروں کناروں بہتا تھا لیکن اسے پینے والا کوئی نہ تھا۔ فریج اور کولر کے ٹھنڈے پانی گھروں کے اندر دستیاب تھے۔ کوئی گھڑے بھرنے کے مشقت کیوں کرتا۔ پہاڑوں سے اترتی چٹانوں سے منہ زور ٹکراتی آبشار ندی بن نشیب میں پر شور بہتی تھی لیکن کپڑے دھونے کو کوئی عورت سر پر پنڈ اٹھا کر پگڈنڈی نہ اترتی تھی کہ اب تو واشنگ مشین کا رواج ہو چلا تھا۔ دیسی صابن کی جگہ واشنگ پاؤڈر استعمال ہونے لگا تھا۔ مونگ پھلی کے کھیت پہلے بٹائی پر دیے گئے پھر بٹائی کرنے والے بھی ادھر مسقط اور دبئی میں سینکڑوں منزلہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے سمگل ہو گئے۔ کاشتکاری کے طریقے فراموش ہو گئے۔ مونگ پھلی، مکئی، باجرہ، جوار اگانے والے کھیت سوکھنے لگے۔۔۔۔ کس اور پہاڑ اترتے چڑھتے رستے کانٹے دار جھاڑیوں سے بھر گئے تھے۔ اب ان پر کون آنے جانے کی مشقت کرتا کہ ہر گھر کے کار پورچ تک سیاہ کشادہ سینے والی پکی سڑک بنی تھی جس پر امپورٹڈ گاڑیاں فراٹے بھرتی تھیں۔ "(15)

پنجاب میں ہمیشہ سے ذات پات کا ایک مضبوط نظام قائم رہا ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ اتنا مضبوط نہیں رہا جتنا پہلے تھا لیکن پھر بھی اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ طاہرہ اقبال اپنے اس ناول میں ذات پات کے نظام کا ذکر بھی کیا ہے کہ جتنی بڑی ذات ہوتی تھی اس کو اتنا بڑا سرکاری عہدہ پیش کیا جاتا۔ اس کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔:

"خاندانوں کی عزت تھی۔ کمی کمین چور اچکوں کو جرأت نہ تھی۔ فوج میں بڑی ذاتوں کے لوگ بھرتی ہوتے۔ انگریز سرکار اپنے درباروں میں خاندانی لوگوں کو کرسی پیش کرتے۔ آج ہر کمی کمین ذات بدل کر شہروں میں جا کر عزت دار بن بیٹھا ہے۔ ہائے انگریز بڑی سیانی قوم، ہائے ایسی سست بھائیاں کس چیز کی کمتی نہ ہوتی۔ زنانیاں سونے سے لدی رہتیں۔ انبار اناج سے خالی نہ ہوتے۔ مارشل ذاتوں کو عزت ملتی۔ سید، اعوان، راجپوت، پٹھان پانچویں کسی ذات کو تو وہ منہ نہ لگاتے۔"

(16)

طاہرہ اقبال ایک منفرد اسلوب کی مالک ہیں جو کہ اب ان کی پہچان بن چکا ہے۔ ان کا یہ اسلوب پنجابی الفاظ کی اردو میں آمیزش سے تشکیل پایا ہے۔ وہ پنجابی زبان کے الفاظ کو اردو میں اس طرح پیوست کرتی ہیں کہ اس کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ان کا استعمال بے جا معلوم نہیں ہوتا۔ پنجابی اردو کے مقابلے میں زیادہ قدیم زبان ہے اور اس کا ذخیرہ الفاظ بھی خاصہ وسیع ہے۔ پنجابی میں استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جن کا متبادل یا مترادف اردو میں موجود نہیں۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک بڑی وجہ ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں کے رہن سہن اور طرزِ بود وباش کا فرق ہے۔ دونوں مختلف تہذیبوں کے مالک ہیں یہی وجہ ہے کہ دونوں زبانوں کی اپنی اپنی مختلف ڈکشن ہے۔ طاہرہ نے اسی فرق کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے لیے ایک منفرد اسلوب تشکیل دیا ہے جس میں پنجابی اور اردو کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ خاص طور پر جہاں انہوں نے پنجاب کے دیہات کی تہذیب، ثقافت اور رہن سہن کو بیان کیا ہے وہاں پنجابی الفاظ کا تڑکا لطف بھی دیتا ہے اور اس پنجابی معاشرت کو سمجھنے میں مددگار بھی ثابت ہوتا ہے۔ "گراں" میں بھی پنجابی کے الفاظ کا بہت زیادہ استعمال ہے جیسا کہ:

ہو کوہائے! چار سال گزر گئے کپتان صاحب نہ آپ پھرے نہ کوئی سکھ سنیہا بھیجا۔ شکیلہ جان اڈیک (انتظار) کی ہر گاڑی کو تکتی اور خالی پٹڑیوں سے اٹھتے دھوئیں کو نگلتی جوانی کھا رہی ہے۔

ہائے کیوں نہ تکے، ٹھیکری نی منگ اے اکبر خانے نی (بچپن کی منگیتر ہے اکبر خان کی)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

سن ادھر کان لا بجھ۔ تائی بختو نے تیز دھر ر میاں تو کرے میں بھریں، پشمینے کی کشمیری کڑھائی والی سیاہ چادر کی بکل کسی اور فاطمہ کے کان میں نسوار زدہ دانتوں کی بھاپ چھوڑتی سانس کا بدبودار قطرہ سا پھونکا۔ بجھ (سن) سراج کشمیری ناں جاتک (لڑکا) ادھر فوج میں نوکر ہے۔ اپنے اکبر خانے کی پلاٹوں میں ہی بھرتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پر ہم کیوں کہیں، جو کہے وہی پھنسے۔"(17)

ایک پیراگراف سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پنجابی الفاظ کے اس روانی سے استعمال نے تحریر کو متاثر کرنے کی بجائے دیہات کی تہذیب کے حوالے سے اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ اس ناول میں موجود پنجابی الفاظ کی فہرست بنائی جائے تو وہ خاصی طویل ہو گی گڈی، لہسو، مڑسواکھیاں، آپوں، بناساں، لنگھ، چیلا، گل بجھ، جاتک، کوفتوں، منجی، جنے، وڑی، گشنی، چھٹ، ادھل، پچھل پائی جیسے سینکڑوں پنجابی الفاظ ناول میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی اشعار بھی جابجا استعمال کیے گئے ہیں۔

طاہرہ اقبال اردو افسانوی نثر کی ایک معتبر اور نمایاں مصنفہ ہیں جنہوں نے مختصر عرصے میں اپنی کہانیوں کے ذریعے وہ مقام حاصل کیا جو بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آتا ہے۔ وہ عہدِ حاضر کی ایک باشعور اور حساس تخلیق کار ہیں جنہوں نے نہ صرف شہری زندگی بلکہ دیہی معاشرت کو بھی اپنی تخلیقات کا اہم موضوع بنایا۔ ان کی کہانیوں میں پنجاب کے دیہاتی کلچر کی ایسی حقیقی جھلک دکھائی دیتی ہے کہ قاری اس ماحول کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال دیہاتی زندگی کے مسائل، وہاں کے لوگوں کے جذبات و نفسیات اور ان کی روزمرہ بول چال سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ مقامی لہجے اور زبان کو اردو کے فنی سانچے میں اس خوبصورتی سے ڈھالتی ہیں کہ ایک دلکش بیانیہ وجود میں آتا ہے۔ اپنی تخلیقات میں وہ پنجاب کے دیہات کے مخصوص ثقافتی رنگ، فطری مناظر، ہوا میں بسی مٹی کی خوشبو اور سماجی و معاشی تبدیلیوں کو نہایت باریک بینی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" دیہی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ انھوں نے گاؤں کی فضا، رسم و رواج، موسموں کے رنگ، کھیت کھلیانوں کی رونق، اور خوشی و غم کے مواقع پر لوگوں کے جذبات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرتا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے دیہات کی زندگی قاری کے سامنے سانس لے رہی ہو۔ مجموعی طور پر، طاہرہ اقبال نے بدلتے ہوئے سماجی و ثقافتی تناظر میں دیہی معاشرت کی منظر کشی بڑی کامیابی سے کی ہے۔ فنی اعتبار سے طاہرہ اقبال کی مہارت یہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کی ثقافت، رسم و رواج اور طرزِ زندگی کو پوری صداقت کے ساتھ الفاظ میں ڈھالا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مغربی معاشروں میں رہنے والے پاکستانیوں کے بدلتے رویوں اور ان کے اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ان کے ناول کا امتیاز یہ ہے کہ "گراں" نہ صرف پنجابی ثقافت کو جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعے اجاگر کرتا ہے بلکہ اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں اپنی ایک منفرد پہچان بھی قائم کرتا ہے۔

حوالہ جات

1-احسان اکبر، پاکستانی ناول ہیت، رجحان اور امکان (مضمون) مشمولہ: "پاکستانی ادب" (تنقید) مرتبہ: رشید امجد، ڈاکٹر اور فاروق علی، سرسید کالج، راولپنڈی: 1992 ص: 809

2-احسن فاروقی، ڈاکٹر "ناول کیا ہے" پیش لفظ از آل احمد سرور، دانش محل، لکھنو: 1948، ص 5

3-جمیل جالبی، ڈاکٹر "پاکستانی کلچر" نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور: 1964 ص 64

4-عرش ملیسانی، بالکمند، مترجم: "قدیم ہندوستان کی ثقافت، تہذیب، تاریخی پس منظر میں" از ڈی ڈی کوسمبی، فینس بک ڈپو لاہور: 1998 ص 23

5-وزیر آغا: ڈاکٹر 'دائرے اور لکیریں" مکتبہ فکر و خیال، لاہور: 1986 ص 80

6-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 16

7-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 189-90

8-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 37

9-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 19

10-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 95

11-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 49-50

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

12-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 22
13-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص28
14-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص24-25
15-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 82-83
16-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص 43
17-طاہرہ اقبال "گراں" جہلم: بک کارنر، 2019، ص